المنار

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ارشاد نبوی صلعم

خدا کی نظر دلوں پر ہے

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ان اللہ لا ینظر الی صورکم واموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم واعمالکم

[مسلم]

[ترجمہ] ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے تھے کہ اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمھاری شکلوں اور تمھارے مالوں کو نہیں بلکہ تمھارے دلوں اور عملوں کو دیکھتا ھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

روشنی اور بلندی کا نشان

المنار

جلد ۴ شمارہ ۱

تعلیم الاسلام کالج لاہور

مدیر اعلیٰ
مطیع اللہ درّد
نائبین: سمیع اللہ قریشی
سعد اللہ ورانی

نگران
شیخ محبوب عالم خالد
بی۔ اے آنرز ایم۔ اے

نومبر سنہ ۱۹۵۳ء

فہرست

عنوان	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ	م۔ ا۔ د	۲
ہمارا تعلیمی نظام	رفیق احمد ثاقبؔ	۳
موجودہ رسائل پر ایک نظر	مطیع اللہ درّد	۶
تین ہزار سال قبل	الف۔ ایم میال	۸
کس طرح گردش...	م۔ ا۔ د	۹
ساقی نامہ	قاصد ظریف	۱۱
یہ مجھے یاد رہے گا	سمیع اللہ قریشی	۱۲
احادیث کی اقسام	صاحبزادہ مرزا بشیر احمد ایم اے	۱۴
شاید کہ اتر جائے...	احمد بشارت اللہ	۱۵

پبلشر جدید ہاشمی نے دستکاری پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

م۔ا۔د

اداریہ

ہمیں افسوس ہے کہ بعض مشکلات کی وجہ سے المنار کا زیر نظر شمارہ وقت پر شائع نہ ہو سکا جس کے لئے ہم قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں

اس دفعہ طلباء کی قلمی معاونت قدرے حوصلہ افزا ہے چیدہ چیدہ مضامین اس شمارہ میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ جن طلباء کے مضامین عدم گنجائش کی بنا پر شائع نہیں ہو سکے انہیں دل برداشتہ نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ انہیں اپنی تحریر کے ادبی اور علمی معیار کو بلند کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ تاکہ ان کے مضامین بھی المنار کی زینت بن سکیں۔ بعض طلباء اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ مضامین کے انتخاب میں "واقفیت" کو دخل حاصل ہے۔ ہم ایسے طلبا کو یقین دلاتے ہیں۔ کہ المنار کے لئے مضامین کے انتخاب میں بے حد احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ المنار میں صرف وہی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ جو المنار کے مسلک کے مطابق اور معیاری ہوں۔ طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ المنار کی سابقہ روایات اور مسلک کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے ادبی شہ پاروں کی تخلیق کریں گے۔

تعلیم الاسلام کالج ایک اہم مقصد کے لئے معرض وجود میں آیا ہے جدید علوم کی ترویج و تعلیم۔ اسلامی نظریات کے پس منظر میں المنار کے پیش نظر یہی مسلک ہے۔

• • • • • •

ادارہ المنار سال اول اور سال سوم کے طلبا کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان روایات کو یاد دلانا چاہتا ہے۔ جو اس کالج کے طلباء کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہی ہیں۔ کالج کی فضا کو فرقہ وارانہ تعصب سے پاک رکھا جاتا ہے۔ ہر طالب علم اپنے مخصوص عقائد پر کاربند رہتے ہوئے کالج کی مجلسی زندگی میں پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ حصہ لے سکتا ہے۔

کالج میں جدید علوم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا میں اسلامی روح پیدا کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ نئے داخل ہونے والے طلبا اس کالج کی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم شعاری۔ سنجیدہ نظری۔ وقار، فرض شناسی، تعلیم و ضبط اور محنت کے بلند معیار کو بلند تر کرنے کی کوشش کریں گے۔ انشاء اللہ

• • • • • •

ہمیں مسرت ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کے ایک طالب علم حمید اللہ بی۔ ایس سی کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں دوم رہے۔ اس نمایاں کامیابی پر ادارہ المنار انہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے دعاگو ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی اس کامیابی کو آئندہ شاندار کامیابیوں کا پیش خیمہ بنائے۔ آمین

• • • • • • •

شمارۂ زیر نظر میں "ہمارا تعلیمی نظام" اس موضوع پر ایک طالب علم کی پہلی کوشش ہے۔ جس میں موجودہ تعلیمی نظام پر طالبعلم کے نقطہ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ مضمون ابھی تشنۂ تکمیل ہے ہمیں توقع ہے کہ طلبا اس موضوع کے دیگر اہم پہلوؤں کو بھی اجاگر

رفیق احمد ثاقب

ہمارا تعلیمی نظام

جہاں تک وقت کا سوال ہے ہمارے ہاں گریجویٹ بننے کے لئے کم از کم چودہ برس تو لگانے ہی پڑتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان میں بھی شاید اس سے زیادہ عرصہ درکار نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود یہ دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ ہمارا گریجویٹ مغربی ممالک کے گریجویٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پس ہمیں یہ سوچنا ہے کہ آخر اس کی وجوہ کیا ہیں؟ یورپ اور امریکہ کے طالب علم ہم سے زیادہ لائق۔ ہم سے زیادہ محنتی اور ہم سے زیادہ ہوشیار کیوں ہوتے ہیں۔ ان ممالک کا طالب علم اپنی تعلیم میں زیادہ دلچسپی کیوں لیتا ہے؟ ان کا بہت آوارہ گرد کہلانے والا طالب علم بھی ہمارے محنتی طالب علم سے زیادہ محنت کیوں کرتا ہے۔

بظاہر اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں۔ یا تو قدرت نے ہمارے دماغوں کو ان کی نسبت ناقص بنایا ہے اور ہم نسبتاً کند ذہن ہیں۔ یا ہمارے دماغوں اور صلاحیتوں کی صحیح رہنمائی نہیں کی جاتی۔ جس سے ہم ذہنوں کو صحیح طور پر استعمال کر سکیں۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ ہمارے طالب علموں کی اکثریت کو مطالعہ کا وہ شوق نہیں ہے۔ جس کے مظاہرہ کی ایک ہونہار طالب علم سے توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ نوے فیصد والدین یہی رونا روتے ہیں کہ ان کا بچہ مطالعہ میں دلچسپی نہیں لیتا لہٰذا کمزور ہے اور بار بار ناکام رہتا ہے

دوسری طرف اساتذہ بھی یہ شکایت کرتے ہیں۔ کہ طلباء باقاعدگی سے محنت نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی میں نتیجہ کی اوسط تیس سے چالیس فیصد کے درمیان رہتی ہے اس کی بنیادی وجہ ہمارا طرز تعلیم ہے جو ناقص اور اصلاح طلب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بچپن کے زمانہ میں بچوں کی تربیت گھروں میں مناسب طریق پر نہیں ہوتی۔ اور اس کی ذمہ داری خود والدین پر پڑتی ہے جو اپنے بچوں میں علمی ذوق پیدا نہیں کرتے۔ ہمارے ملک کی اقتصادی بدحالی بھی کافی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ جس کی وجہ سے حکومت کثرت سے درسگاہیں نہیں کھول سکتی۔

بہرحال بنیادی چیز طریقہ تعلیم ہے۔ ہمارا رائج الوقت نظام یقیناً قابل اصلاح ہے۔ بچہ جب پہلے پہل سکول میں داخل ہوتا ہے تو اس کی عمر پانچ چھ برس کی ہوتی ہے۔ اسے ایک مڈل بلکہ پرائمری پاس استاد سے واسطہ پڑتا ہے۔ جس کا خود اپنا علم بھی کچھ پختہ نہیں ہوتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کا "مولا بخش" بھی ہمیشہ استعمال ہوتا رہتا ہے۔ وہ بچہ ایسے استاد کو جلاد تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسے استاد سے بچے کو کیا انس ہو سکتا ہے۔ جس کا کام صرف مارنا پیٹنا ہی رہ گیا ہو وہ محض ڈنڈے کے زور سے اسے سبق یاد کرانے کی کوشش

کرتا ہے۔ ایسی صورت میں بچہ سبق کو زبانی یاد تو کر سکتا ہے مگر اسے سمجھ خاک نہیں آتی۔ استاد کا نام سنتے ہی بچہ کانپ اٹھتا ہے اس لئے وہ سکول جانے سے گھبراتا اور ڈرتا ہے۔ بہت سے بچوں کو سکول سے بھاگ جانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو اس مار پیٹ سے بچنے کے لئے سر پر ٹوکری اٹھانا پسند کرتے ہیں۔ اور زیور تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جب بچہ کسی نہ کسی طرح پرائمری کا امتحان پاس کر کے حصہ مڈل میں داخل ہوتا ہے تو مار پیٹ کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ اب بغیر مار کے وہ پڑھتا نہیں ہے۔ اور اگر پٹائی نہ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نالائق رہتا ہے ہر وقت گالیوں اور گھرکیوں کی وجہ سے خود کو نالائق تصور کرتا ہے اور ایک عجیب احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے آخر کسی نہ کسی طرح وہ میٹرک کا امتحان پاس کرتا ہے اور کالج میں داخل ہو جاتا ہے یہاں وہ کچھ اور ہی نظارہ دیکھتا ہے نہ تو پہلے سے وہ سخت گیر استاد ہیں اور نہ سکول کی سی پابندیاں۔ ماحول یکسر بدل جاتا ہے۔ پروفیسر آتے ہیں لیکچر دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں نہ کوئی سوال اور نہ جواب اور نہ گھر کا کام "سکول کی قید و بند سے آزاد ہو کر اس قسم کے آزادانہ ماحول میں طالب علم حد سے زیادہ مسرت محسوس کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دیتا۔ اور آوارہ گردی میں ہی دن گزارنے شروع کر دیتا ہے اس قسم سے طلبا کا وقت پر سنبھلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ناکام رہ جاتے ہیں۔

ہمارا نصاب بھی کچھ عجیب معجون مرکب سا ہے۔ کام کی باتیں اس میں بہت کم ہیں۔ ایسی کہ جن سے عملی زندگی میں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہو اس قسم کی تعلیم کا نہ قوم کو فائدہ ہے اور نہ ملک کو۔ اور نہ ہی طالب علم کو اس علم سے کچھ حاصل ہوتا ہے۔ کالج کیا ہیں محض کلرک بنانے کی فیکٹریاں ہیں۔

نصاب اور کتب کے علاوہ ایک اور اہم چیز ہے جسے ہم ماحول کا نام دیتے ہیں۔ اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے حکومت ہمارے کالجوں اور سکولوں پر اس قدر رقم نہیں خرچ کر سکتی۔ جس کی وجہ سے طلبا کو خود بخود اپنے سکول یا کالج کی عمارت سے لگاؤ پیدا ہو جائے۔ انگلستان اور امریکہ کے سکولوں کی عمارتیں ایک نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہاں طلباء کی آرام و آسائش کا تمام سامان مہیا ہوتا ہے۔ اور وہ بڑے اطمینان سے تحصیل علم میں مشغول رہتے ہیں۔ ہر قسم کی آسائش انہیں میسر آتی ہے۔ اس لئے سکول سے باہر کی سرگرمیاں اور پُر رونق بازار وغیرہ ان کے لئے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ اس کے بالمقابل ہمارے ہاں درسگاہوں کا ماحول خراب ہوتا ہے۔ عمارتیں بوسیدہ فرنیچر ٹوٹا پھوٹا اور ناکافی۔ صفائی مفقود۔ طلبا ان سے اپنی دلچسپی برقرار رکھ سکیں تو کیسے؟

یہ چیزیں بظاہر بے حقیقت سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دراصل ہمارے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہیں۔ ماحول کا اثر انسان پر ضرور پڑتا ہے۔ جس طرح کا ماحول ہو اسی طرح کی عادات انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بلکہ آج کل کے ماہرین کا تو کہنا ہے کہ رنگوں کے متواتر مشاہدہ کا بھی انسانی فطرت پر بہت حد تک اثر ہو جاتا ہے۔ مثلاً سرخ رنگ دیکھتے رہنے سے غصہ پیدا ہوتا ہے۔ نیلے رنگ کی وجہ سے ہم میں غور و فکر کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور سیاہ رنگ کی وجہ سے ہماری طبیعت حزن و ملال اور اداسی کی طرف راغب نظر آتی ہے۔ اسی طرح اور بھی بیشمار ایسی چیزیں ہیں جن سے ہماری طبیعتیں اثر پذیر ہوتی ہیں کاش ہمارے ماہرین تعلیم بھی ان چیزوں کی اہمیت

کو سمجھیں اور طلباء کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کریں

ایک انگریز مصنف نے اپنے ہاں کے سکولوں کی ایک جھلک اپنی کتاب "THE BRITISH SCHOOLS" میں دکھائی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

ہمارے ہاں سکولوں میں وقت مقررہ پہ تمام طلبا اپنے مخصوص لباس میں نہایت خاموشی سے اپنے کلاس روم میں بیٹھ جاتے ہیں۔ کمروں کی صفائی پہلے ہی سے اچھی طرح کی جا چکی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ڈاکٹر آکر تمام طلبہ کا معائنہ کرتا ہے انکے جسم کی صفائی اور لباس وغیرہ پہ اچھی طرح نگاہ ڈالتا ہے۔ بوٹ کی پالش۔ دانت۔ ناخن۔ سر کے بال غرضیکہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ جو سبق پڑھانا مقصود ہوتا ہے استاد ایک دن پہلے ہی اس کی تیاری کر لیتا ہے۔ اس کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی طالب علم کلاس روم سے اچھی طرح سبق سمجھے بغیر نہ جائے۔ جو سبق پڑھانا ہو اسے ایک دن پہلے ہی تختۂ سیاہ پہ لکھ دیا جاتا ہے۔ ہر استاد کا ایک نگران بھی ہوتا ہے۔ جو اس کی نگرانی و رہبری کرتا ہے۔ . . . .

. . . .

یہ لوگ ماہرین نفسیات بھی ہوتے ہیں۔ اور دیکھتے رہتے ہیں۔ کہ استاد کے سبق میں طلباء دلچسپی لے رہے ہیں یا نہیں اگر کوئی لڑکا سبق کے دوران میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا پایا جاتا ہے تو اس کی ذمہ داری بھی استاد پہ ہوتی ہے۔ کہ کیوں اس نے اپنے سبق میں اتنی دلچسپی پیدا نہیں کی کہ طلبہ اسمیں محو ہو جائیں اور گرد و پیش کو بھول جائیں۔ سبق ختم ہونے کے بعد چھپے ہوئے فارم طلبا میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا ہے۔ اس کا امتحان اسی وقت لے لیا جاتا ہے۔ جو طالب علم پڑھائی میں اچھے نہیں نکلتے ان کا نفسیاتی تجزیہ کر کے معلوم کیا جاتا ہے۔ کہ انہیں کس شعبہ کی طرف زیادہ رغبت ہے۔ انہیں پڑھائی کی بجائے اس فن کی تربیت دی جاتی ہے۔ جس کی طرف ان کا طبعی میلان ہو۔

اسی طرح وہ لکھتا ہے کہ ہمارے ہاں استاد اور شاگرد بالکل دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ان کی آپس کی کوئی بات ایک دوسرے سے مخفی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بچے میں بری عادتیں پیدا ہو رہی ہوں۔ مثلاً جھوٹ۔ چوری وغیرہ تو استاد کو فوراً علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ مناسب طور پر اسے سمجھا دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ بچہ کی یہ خراب عادتیں اس سے بالکل چھوٹ جاتی ہیں۔ شاید اسی لئے وہاں امتحان میں نقل کرنے کا شاذ و نادر ہی کوئی واقعہ ہوتا ہو۔

وہ لوگ علم کو علم کی خاطر پڑھتے ہیں۔ اپنے اندر لیاقت اور قابلیت پیدا کرنا ان کا مقصد ہوتا ہے اپنا نام دنیا میں بلند کرنے کا ان میں ایک ولولہ ہوتا ہے۔ ان کے اساتذہ ان سے پوری وابستگی رکھتے ہیں۔ اور انہیں نہایت شوق اور محنت سے پڑھاتے ہیں۔

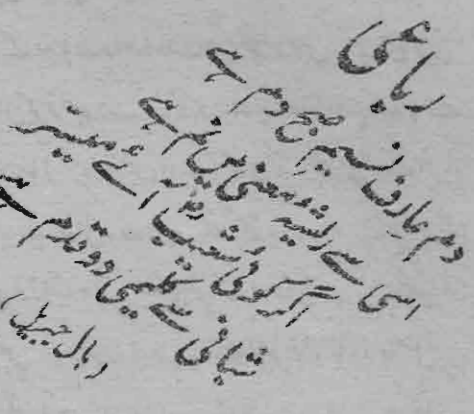

مطیع اللہ دردؔ

موجودہ رسائل پر ایک نظر

ان دنوں ملک کی ادبی فضا پہ پھر کہر کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ادب کا رجحان کسی نامعلوم منزل کی طرف ہے۔ ادب کے علمبردار ابھی تک اپنی منزل کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہیں۔ ہر ادیب اپنے نظریات کی صحت پر یقین رکھتے ہوئے اس بات پر مصر ہے کہ اس کے خیالات کو اوّلی مقام حاصل ہے۔

ادب کی تشریح بہت سے مفکرین نے کی ہے۔ والٹر اسکاٹ لکھتا ہے کہ

"ادب وہ آئینہ ہے جس میں کسی زمانہ کے عالمگیر مقاصد اور مروجہ دستور العمل کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے"

میتھو آرنلڈ کی رائے ہے "ادب حیاتِ انسان کی تنقید ہے"

ان مغربی مفکرین کے اقوال سے مجھے کوئی اختلاف نہیں کیونکہ میں خود بھی ادب کو انسانیت کے ارتقا کا آئینہ دار سمجھتا ہوں انسان کے جذبات و احساسات میں جو موجیں برابر اٹھتی رہتی ہیں۔ ان کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا دینا ادب کہلاتا ہے موجودہ رسائل صحیح معنی میں ادب کی کہاں تک عکاسی کرتے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے۔ جس نے مجھے بارہا یہ سوچنے پہ مجبور کیا کہ ہماری نوزائیدہ قوم جس کی تعمیر کے ارتقائی دور بہت کٹھن اور ناہموار ہیں۔ اپنے ادبی سرمایہ سے خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر رہی۔ تعمیر ملت کے لئے ادب اشد ضروری ہے۔ یہ ایسا امر ہے جسے مدنظر رکھنا ادبی رسائل کے لئے ایک لابدی امر ہے۔ موجودہ رسائل تعمیر قوم کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اور انہیں ایسا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ زندہ قوم کا نشان ہوتا ہے یہی رسائل قوم کے ذہنوں کو منزل کے گڑھے کی طرف دھکیل سکتے ہیں اور یہی اپنی مخلصانہ روش سے قوم کے ذہن کو پستی سے نکال کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔

میں اس مضمون میں تعمیر قوم میں ادب کے کردار پہ کچھ زیادہ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ ملت کی تعمیر میں زیادہ دخل ادب کو حاصل ہے۔ اگر کسی قوم کا ادبی مواد ارفع و اعلےٰ ہے تو یقیناً وہ قوم بھی عمدہ کردار کی مالک ہو گی۔ اور اگر ادب ناقص ہے تو لازماً قوم بھی پست خیالات کی حامل ہو گی۔ اس متمدن دور میں ادب اور قوم اس طرح گھل مل گئے ہیں۔ کہ انہیں جدا کرنا ناممکنات سے ہے یہ دونوں ایک دوسرے پہ دور رس اثرات چھوڑتے ہیں۔ ادب ماحول کی تخلیق کرتا ہے۔ اور ماحول ادب کو جنم دیتا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ ملکی رسائل اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی خلوص نیت سے کوشش کریں۔ پاکستانی قوم کا ادبی سرمایہ کسی زندہ قوم کے ادبی سرمایہ سے کم نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن آج کل ہمارے رسائل جس

ڈگر پر چل رہے ہیں۔ وہ قابلِ افسوس ہے۔ خصوصاً علمی رسالے جو ادبیت کے دعویدار ہیں۔ لیکن قوم کیلئے سمِ قاتل کا درجہ رکھتے ہیں

ادبی رسالوں کی اکثریت بھی ردی کے طور پر استعمال کی جانے کے قابل ہے۔ موجودہ ادبی رسائل میں سے اکثر اپنے لئے مواد اس نظریئے سے حاصل نہیں کرتے کہ وہ ادب کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ بلکہ محض اس لئے اسے اپنے رسالے کی زینت بناتے ہیں۔ کہ یہ ان کے کسی عزیز دوست یا رشتہ دار کا لکھا ہوا ہوتا ہے بہت سے اچھے لکھنے والے موجود ہیں۔ لیکن وہ منظرِ عام پر اس لئے نہیں آتے کہ ان کا کسی رسالے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک نیا ادیب جو اچھے ادب کو جنم دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ محض اس وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔ کہ موجودہ رسائل اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے

بعض ادبی رسائل اپنے حاصل کردہ مواد کا کچھ معاوضہ دیتے ہیں۔ ادیب جو یہ سمجھتا ہے کہ اس کے عوض اسے کچھ روپے مل جائیں گے۔ وہ عمدہ اچھی اور ٹھوس علمی و ادبی چیز مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ایڈیٹر بھی مصنف سے ٹھوک بجا کر تصنیف شدہ مواد حاصل کرتا ہے۔ ایسے رسائل بہت کم ہیں جو محض اس وجہ سے قیمت ادا کرتے ہیں کہ واقعتاً یہ مواد ادبی لحاظ سے مناسب ہے۔ ورنہ یہاں بھی "واقفیت" اپنا کام کرتی نظر آتی ہے۔ آپ ایسے رسالوں میں چند مخصوص ادیبوں کے کے سوا کسی اور کو نہیں دیکھیں گے۔ بہرحال یہ رسائل دوسرے رسائل کے مقابلہ میں بہتر ہیں۔

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں ادب سے متعلق ہیں۔ رسائل کو اسی کسوٹی پر پورا اترنا چاہیئے۔ جب تک ادب کو اس کا اصل مقام نہ دیا جائے گا اس وقت تک

موجودہ منہ لپے ادبی رسالے صحیح معنی میں ادبی نہیں ہو سکتے

بعض رسائل ادب کو فحاشی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

"ہیگل شوپن ہار" کے نظریئے کے مطابق "ادیب کا واحد مقصد تلاش حسن ہے"۔ اس سے غلط فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایسے رسائل اپنی بے حیائی اور بے شرمی سے قطع نظر بڑے ناز سے لکھتے ہیں۔ کہ یہی اصل ادب ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یہی لوگ ادب کی حقیقی خدمت کر رہے ہیں۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ایسے ادب کے لئے مستقبل قریب میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ رسائل دعویدار ہیں "اصلیت" کے۔ حالانکہ وہ اخلاقی لحاظ سے بے حیائی۔ بے شرمی اور عریانی کو اصلیت کا نام دیکر ادب میں گھسیٹ رہے ہیں۔ قوم کو ذہنی اعتبار سے مفلوج کرنے کا یہ ایک اور طریق ہے۔

سیاسی رسائل کی ملک میں کمی ہے۔ کچھ رسائل اس کمی کو پورا کر رہے ہیں۔ ان رسائل کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی بے لاگ تنقید سے قوم کو ملک کے مسائل کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ اور انہیں کسی ٹھوس کام کے لئے ابھاریں۔ سیاسی رسائل کا واحد مقصد حدیث نبوی کے مطابق "جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا" اور غیر جانبدارانہ تنقید ہونا چاہیئے۔

سعد درانی

رباعی

موت کیا ہے! موت تو کچھ بھی نہیں
یہ فقط نامِ شکستِ ساز ہے
ہاں مگر یہ زیست مرگِ انجامِ سعدؔ
درحقیقت سوچنے کا راز ہے

الف۔ ایم میاں:۔

تین ہزار سال قبل

ہڑپہ ضلع منٹگمری (سابق شاہوالی)

ہڑپہ کے کھنڈرات شہر منٹگمری سے تقریباً دس گیارہ میل پر مغرب کو ہوں گے۔ جس سے کچھ دور مغرب کی طرف دس میل کے فاصلہ پر ایک پرانا شہر چیچہ وطنی ہے۔

آج کل لفظ "ہڑپہ" دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک پرانا ہڑپہ جہاں پرانے یعنی آج سے کم از کم تین ہزار سال قبل کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ اور دوسرے موجودہ ریلوے سٹیشن ہڑپہ روڈ۔

• • • • • • • • • • •

ہڑپہ کے کھنڈر ریلوے لائن سے دو اڑھائی میل شمال میں ہیں۔ ایک پختہ سڑک ریلوے لائن اور پرانے ہڑپہ کو ملاتی ہے جو حال ہی میں تیار کی گئی ہے۔ اگر آپ کو ہڑپہ جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ آج بھی یہ علاقہ کس قدر سرسبز و شاداب ہے ہرے ہرے کھیتوں میں بڑے بڑے کھنڈر دلفریب نظر آتے ہیں

۱۹۲۲ء میں جب کہ ماہر آثار قدیمہ مسٹر آر۔ ڈی بینرجی نے جو اس وقت مغربی حلقہ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ موہن جو دارو (ضلع لاڑکانہ) میں کھنڈر کھودنے کا کام شروع کیا تو پنجاب میں ہڑپہ کے مقام پر اسی سال رائے بہادر دیارام نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔

ہم ہڑپہ کی سیر کے لئے گئے تھے۔ تو انہی ایام میں پاکستان کے ماہرین کھدائی کا کام کروا رہے تھے۔ اور اکثر لوگ دیکھنے کی غرض سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔

ہڑپہ کا سربمکان دھوپ سے خشک کی ہوئی چھوٹی اینٹ سے بنایا گیا ہے۔ یہ چند ایک ٹیلوں کو طے کر کے ایک وسیع کھنڈر میں جا نکلے جس کی دیواروں میں سے کوئی چھ فٹ اونچی اور کوئی چار فٹ اونچی تھی۔ اس کے ہر گھر سے گندے پانی کی ایک نالی باہر نکلتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان گھروں میں غسلخانے بنے ہوئے تھے۔ اکثر گھروں کے نیچے تہ خانے بھی معلوم ہوتے ہیں بے شک یہ گھر برباد ہوئے ... ۳ سال گزر گئے۔ مگر یہ اب تک اپنی عظمت اور بنانے والوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ تمام شہر جو اب تک کھودا گیا ہے۔ اس کی سڑکیں چوڑی اور کشادہ ہیں۔ بعض مقامات پر بہت موٹی موٹی دیواریں اور بڑے بڑے محلات کے کھنڈر معلوم ہوتے ہیں۔ بعض جگہ پر کچھ اس طرح کے کھنڈرات ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہر کئی بار اجڑا اور بسا یاد رہے کہ شہر کی کھدائی کا کام چھوٹے چاقوؤں اور نشتروں سے کیا جاتا ہے۔ وہ بھی نہایت احتیاط کے ساتھ۔ اگر کھودتے کھودتے کہیں بالکل معمولی سی اینٹ نکل آئے تو بالکل آہستہ آہستہ اس کے اوپر سے مٹی ہٹائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ شاید یہ کسی بڑے محل کی تمہید ہو۔

ہم نے وہاں مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن بھی دیکھے۔ ایک

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

م۔ا۔و

کس طرح گردشِ دوراں کو رلایا میں نے

شعور اور لاشعور کے تانے بانے ایک دوسرے سے الجھ کر علیحدہ ہو گئے۔ حالات کو پرکھنے اور سمجھنے کی قوت تیز ہو گئی۔ تو اس احساس نے میرے دل کو پژمردہ سا کر دیا کہ قسام ازل نے بہت سے انجانے غم میرے جھولے کو لکھ دیئے ہیں۔ ابتدا ر میں غم زمانہ کی چوٹ کا احساس دل پر ٹھیس لگاتا مگر اٹھتی عمر کا لاابالی پن جلد ہی اسے دبا دیتا۔ گردشِ روزگار کے نت نئے چرکے میرے ناداں سے دل کو زندگی کے تلخ حقائق سے دوچار کرتے رہے حیات کے نشیب و فراز گزرتے گئے۔ وقت کی ضربوں نے مجھے دنیا سے دنیا والوں سے اور خود اپنے آپ سے بیزار کر دیا۔ زندگی مجھے ایک ذلیل شے نظر آنے لگی۔ مجھے اپنے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگی ہوئی محسوس ہوتی۔ میں سوچتا کاش ایک ہی دفعہ شعلے کی طرح جل کر بجھ جاتا۔ دل و دماغ کو پگھلا دینے والی تپش میں سلگ سلگ کر جئے جانا کس قدر اذیت ناک ہے۔ پژمردگی بڑھتی گئی اور میں بے جان و نڈھال سا ہو کر رہ گیا۔ سب نے میری گرتی ہوئی صحت کو بیماری پر محمول کیا۔ سب نے مجھے بیمار سمجھا مگر میرے دل میں غم کی ڈوبتی ابھرتی لہروں کو کوئی نہ دیکھ سکا کسی نے میرے روگ کو سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں خود ہی دل کو تسلی دے لیتا کہ دکھ کے بعد سکھ بھی ضرور میرا منتظر ہو گا۔ عرصۂ محرومی کی طوالت سے گھبراتا تو فانیؔ کا یہ شعر زبان پر آجاتا۔

یا رب تیری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تیری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیئے

دن بیتتے گئے۔ خزاں بہار میں اور بہار خزاں میں تبدیل ہوتی گئی اور میں ؎

بے دل سے بے خیال سے بے اعتبار سے
کھیلا کئے فضائے بہار و خزاں سے ہم

ایک مرتبہ کسی نے میرے اضمحلال کو دیکھ کر کہا بگلے! دنیا تو ہے ہی دارالمحن اس کے رنج سے گھبرا جانا بزدلی ہے آدمیت کو چیلنج ہے۔ موت تو وقت پر ہی آئے گی۔ زندگی کو موت سے بدتر بنا لینا دانشمندی نہیں۔ بہت سے حوادث کو شکست دینے کی سعی کیوں نہیں کرتے۔ دل بھی اس پر تیار سا ہو گیا اور میں نے اپنی زندگی کا ایک نیا باب شروع کیا۔ جسے دیکھئے والے قہقہوں سے بھرپور جانتے ہیں میں نے بے وجہ ہی ہنسنے کی کوشش کی ناکام تو ہوا۔ مگر دل نے اس ناکامی کو قبول کرنے سے گریز کیا۔

قدرت کو بھی کچھ رحم آگیا۔ اور میری مسلسل کوشش کی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ میں نے اپنے رنج کی لہروں کو دوسروں کی خوشی میں شریک ہو کر دبا دیا۔ آنسوؤں کو اوپر سے قہقہوں میں بدل دیا۔ زندگی میں دوبارہ رنگ سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے

اپنی روح کی اداسیوں کو کم ہوتے محسوس کیا۔ اور ارادہ کر لیا کہ بھاگتے ہوئے وقت سے میں اپنے حصے کی مسرتیں چھین لونگا۔ دنیا کی ستم انگیزیاں بڑھیں تو۔ مگر میری معنی خیز مسکراہٹ کو شکست نہ دے سکیں۔ میرے قہقہوں کے بے ہنگم شور کو دبا نہ سکیں۔ حیات دو روزہ میرے لئے بھی دلچسپیوں کا مرکز بن گئی۔ زندہ دلی زندگی کا نام ہے۔ مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔ میں نے دکھی رہنے والی روح کو بدل کر زندگی کو زندہ دلی سے دیکھنا شروع کر دیا لاکھ گردش زمانہ نے رنگ بدلے اور مجھ پر غالب آنا چاہا۔ مگر ؎

ہر مصیبت کا تبسم سے دیا میں نے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا میں نے

سعد درانی

مجھے حسین سہاروں پہ اعتبار نہیں

مجھے چمن کی بہاروں پہ اعتبار نہیں
کلی پہ گل پہ ہزاروں پہ اعتبار نہیں
یہ سب طلسم مجھے وہم ہے نظر آتا
مجھے فلک پہ ستاروں پہ اعتبار نہیں
فضا یہ وسعتِ تخیل کے سوا کیا ہے
مجھے افق کے شراروں پہ اعتبار نہیں
شبِ دراز میں زندہ رہیں یہ تابِ سحر
مجھے تو درد کے ماروں پہ اعتبار نہیں
خزاں بہار کی آمد کا ہے نشان مگر
مجھے حسین سہاروں پہ اعتبار نہیں

سمیع اللہ قریشی

"تو!"

کوئی ہے جو میرے لئے مرے غم زندگی کو سمجھ سکے
کوئی ہے جو عالمِ یاس میں مرے غم کا رنگ بدل سکے
کوئی ہے جو آج دلِ حزیں کو اداسیوں سے بچا سکے
کوئی ہے جو اس دلِ بے قرار کی دھڑکنوں میں سنبھل سکے
جو میرے خیال کی رفعتوں کو نہ چھو سکے اسے کیا کروں
مجھے اس سے کیا جو مرے سکون کی ساعتوں میں نہ کھو سکے
اسے کیا کروں جو مری نگاہ کی وسعتوں پہ نہ چھا سکے
مجھے اس سے کیا کہ جو میرے شوخ دل کے داغ نہ دھو سکے
جو تری طرح مری الجھنوں کو سنوار دے وہ کوئی نہیں
جو تری طرح مرے دل کے ساز کو سن سکے وہ کوئی نہیں
وہ کوئی نہیں جو تری طرح مرے دل کی بات بنا سکے
جو تری طرح مرے دل کے راز کو پا سکے وہ کوئی نہیں
جو ترے حضور ترے قریب ترے جوار میں نہ چلے
جو پھر ایک بار بلا سکے مجھے اپنے پاس وہ کون ہے
جو مری نگاہ سے دور ہو کے مری نگاہ کے پاس ہے
جو دوا کرے مرے درد دل مرے رنج و غم کی وہ کوئی ہے
جو مرے نصیب کو پھر زوال کے دائروں سے نکال لے
جو مجھے عروج کے راستوں پہ رواں کرے وہ تو ہی تو ہے
جو مرے خیال کی رفعتوں سے کہیں رفیع و بلند ہے!
جو کسی بیان کی وسعتوں میں نہ آ سکے وہ تو ہی تو ہے!

قاصد ظریف

ساقی نامہ

بہت دن سے فسردہ ہے مری یہ زندگی ساقی
مرے ہونٹوں پہ مدت سے نہیں آئی ہنسی ساقی

گھڑی بھر کے لئے اچھی نہیں یہ بیخودی ساقی
پلا وہ شئے کہ مل جائے حیاتِ سرمدی ساقی

پلائی تھی جو تو نے رات وہ کیا چیز تھی ساقی
وہی ہیں سوزشیں دل کی وہی تشنہ لبی ساقی

وہی ہم ہیں، وہی تم ہو، وہی صہبا وہی ساغر
مگر ہے آج بدلی سی وہ طرزِ مے کشی ساقی

کوئی سمجھا نہ تھا اب تک مری بیتابیٔ دل کو
زہے قسمت مری یہ آنکھ سب کچھ کہہ گئی ساقی

مرے غم کے افق پر وہ ستارے اب بھی ہیں رقصاں
کہ جن سے درد کی دنیا میں ہے تابندگی ساقی

یہاں تو آج بھی سجدے تڑپتے ہیں جبینوں میں
نواہائے شکستہ میں اثر ہے آج بھی ساقی

تیری محفل میں ہم پہنچے تو پھر بیگانگی کیسی؟
مزہ جب ہے کہ تو بھی کچھ ہمارے ساتھ پی ساقی

بتاؤ کس طرح ہم کو کسی پہ اعتبار آئے
جہاں ہو آدمی کا دشمنِ جاں آدمی ساقی

چلو پھر لالہ و گل میں وہ سوزِ آتشیں پھونکیں!
چمن والوں کو دے دیں ہم پیامِ زندگی ساقی

غمِ دوراں نے احساسِ مسرت تک مٹا ڈالا
کہاں تک کر سکو گے تم مری چارہ گری ساقی

ذرا سا دیکھ لو تم بھی مرے ویرانۂ دل کو!
یہ وہ دنیا ہے جو آباد تھی پہلے کبھی ساقی

ملا ہے دل ہی کچھ ایسا جو ہر دم روتا رہتا ہے
یہ آنکھیں بھی ہمیشہ سے رہی ہیں شبنمی ساقی

مگر پھر بھی چمن کی ہر کلی افسردہ رہتی ہے
نظر شبنم کی اس پہ گو ہمیشہ سے رہی ساقی

خدا جانے وہ میرا چاند کس بستی میں اترے گا
نہ جانے کس کے آنگن میں کھلے کی چاندنی ساقی

جنوں اپنا سلامت ہے تو ہیں لاکھوں گریباں بھی
خود اپنے چاک کی کر لیں گے ہم بخیہ گری ساقی

ترا قاصد تری دیوار کے سائے تلے ہوگا
اب اس کا پوچھنا کیا۔ حال ہے ناگفتنی ساقی

سمیع اللہ قریشی

یہ مجھے یاد رہے گا

اس دن سب دوستوں نے مل کر پروگرام بنایا کہ دریا کی سیر کی جائے۔ اور چناب پر پکنک منائی جائے۔ والی بال کا میچ اور مشاعرہ بھی وہیں ہوں۔ اب تو تعطیلات ختم ہونے کو ہیں۔ پھر نہ جانے کب اکٹھا ہونے کا موقع ملے۔ ستمبر کے پہلے ہفتہ میں کالج کھل رہا ہے۔ کیوں نہ ایک یادگار دن مناتے چلیں۔ ایک ایسا دن جسے ہم کبھی نہ بھول سکیں۔ جس کی یاد زندگی بھر دل میں چٹکیاں لیتی رہے۔

اور پھر سچ مچ اگلے جمعہ صبح ہی ہم چند دوست کشتیوں پر سوار چناب کی موجوں سے کھیل رہے تھے۔ بڑا سہانا سماں تھا مشرق کے افق سے اودے اودے بادل امنڈ امنڈ کر وسیع وبسیط آسمان کی نیلاہٹوں میں جذب ہو رہے تھے۔ چناب کے کنارے کالی کالی چٹانوں کا ایک سلسلہ اور اس کے دامن میں اُگی ہوئی لمبی لمبی سبز گھاس بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کیا حسین نظارہ تھا۔ دو کشتیاں ساتھ ساتھ چناب کا آبی سینہ چیرتی ہوئیں پل کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔ نوجوان ساتھیوں کے ننگے بازوؤں کی ابھری ہوئی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ چپو اٹھ اٹھ کر پانی کو روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ جیسے چناب کی طوفانی لہروں کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ راحیل اور راشد کنارے پر کھڑے کیمرے فٹ کئے ہماری تصویریں لے رہے تھے۔

رضوان ہمارا غیر ملکی دوست بھی ہمارے ساتھ ہی اس سیر کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اسے ٹوٹی پھوٹی اردو بھی آتی تھی۔ لیکن ہم اس سے عموماً انگریزی میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے حبشہ سے پاکستان ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے ہمارے پاس آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اسلام کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے مبلغ اسلام بنے۔ تاخدا اور اسلام کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا دے۔

ظہر کے قریب ہم کشتی رانی سے فارغ ہو کر کنارے سے ذرا دور کھجوروں کے ایک جھنڈ میں چلے گئے۔ وہاں کھانا کھایا۔ اور نماز کے لئے تیار ہو گئے۔ رضوان نے اپنے مخصوص عربی انداز میں اذان کی آواز بلند کی۔ کتنا سوز تھا اس کے لہجہ میں۔ میں خود بڑی اچھی آواز سے اذان کہہ سکتا ہوں۔ ہمارے گاؤں کا مؤذن سراج الدین گردونواح میں اذان دینے کے لئے مشہور تھا۔ لیکن آج کی اذان میں کچھ اور ہی لطف تھا۔ رضوان نے اذان دے کر ایک پیارا سماں باندھ دیا۔ اس کی رسیلی آواز چناب کے کنارے ایک چھوٹے سے نخلستان سے اٹھ اٹھ کر چناب کی وسعتوں میں گونجتی رہی۔ اور میں ہمہ تن گوش سرنگوں بیٹھا دل ہی دل میں اذان کے پر عظمت الفاظ دہرا تا رہا۔

نماز ہوئی اور پھر سب دوستوں کے مشورہ سے ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ لطف المنان ساحر اور مطیع اللہ درد کے مذاحیہ اشعار سن کر سب ساتھی ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ عبد الماجد شاہد اور عبد الباسط نے بھی اپنی نظمیں سنائیں۔ سب سے آخر میں میں نے بھی دوستوں کے اصرار پہ موقع کی مناسبت سے اپنی نظم

"چناب" سنائی۔ جو بہت پسند کی گئی۔ اور خصوصاً اس کا آخری بند۔ مبشر لطیف تو اسے جھوم جھوم کر پڑھ رہے تھے۔

کسی غریب کے غم میں شریکِ غم ہو کر
چناب رنگ کی آزادیوں میں کھو جاؤں
مرے چناب تری وسعتوں میں گم ہو کر
ترے قریب تری وادیوں میں سو جاؤں

رضوان مبشر لطیف کی حالت سے بڑے متاثر دکھائی دیتے تھے ان کے پوچھنے پر میں نے انہیں آخری شعر کا مطلب سمجھایا تو ایک لمبی آہ بھر کر کہنے لگے "کاش ایسا ہو سکے۔ کاش اس مقدس اور پر ایمان وادی میں ہمیشہ کی نیند سونے کی سعادت مجھے بھی مل سکے"

مشاعرہ کے بعد کبڈی اور والی بال کے میچ ہوتے رہے اور اسی کھیل کود میں نماز عصر کا وقت ہو گیا۔ سب ساتھی وضو کرنے لگے۔ میں نے اذان کہی۔ اتنے میں کچھ دوست نماز کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ میں نے کہا "رضوان نہیں آئے اور اختر بھی موجود نہیں" سلیم نے کہا "وضو کر رہے تھے۔ ابھی میں ان کے پاس سے آیا ہوں"۔ ہم لوگ نماز پڑھنے لگے شاید آخری رکعت تھی کہ چیخیں سنائی دیں۔ مسلسل چیخیں۔ میں کانپ سا گیا۔ اور سلام پھیر کر جلدی سے کنارے کی طرف بھاگا۔ اُف! میرے خدا! وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ رضوان ڈوب رہے تھے اور اختر انہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ میں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ سلیم۔ منان۔ ماجد۔ راشد جلدی آؤ رضوان ڈوب رہے ہیں۔ اور پھر غڑاپ سے میں نے بھی دریا میں چھلانگ لگا دی۔ سلیم اور ماجد بھی تیرتے ہوئے آ رہے تھے۔ لیکن رضوان کے قریب سخت کوشش کے باوجود کوئی بھی نہ پہنچ سکا۔ چناب کی تند موجیں انہیں اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔

اختر کی بھی بُری حالت تھی۔ بڑی مشکل سے کھینچ تان کر اسے کنارے پر لایا گیا۔ اسی وقت غوطہ زن بلائے گئے۔ آخر تین گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد رضوان کے جسم کو تلاش کر لیا گیا۔ لیکن اب ہمارے سامنے جیتے جاگتے رضوان نہیں تھے۔ رضوان کی لاش تھی۔ ڈاکٹر منور احمد بھی اطلاع ملتے ہی کار پر پہنچ چکے تھے سلیم ڈھاریں مار مار کر رو رہا تھا۔ میں نے روتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سے کہا "ڈاکٹر صاحب کسی طرح ہمارے رضوان کو بچا لیجئے ڈاکٹر صاحب خدا کے لئے....." لیکن ڈاکٹر صاحب سسکیاں بھرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ظہیر! تمہارا رضوان موت کے گھاٹ میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کی روح اپنے پیدا کرنے والے سے ملاقات کے لئے پر تول چکی ہے"۔ آہ رضوان ہم سے جدا ہو گئے آہ ہم حبشہ کی بھیجی ہوئی امانت کی حفاظت نہ کر سکے۔ رضوان شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

رضوان کی لاش کو ایک چارپائی پر ڈال کر ہم سب آنسو بہاتے ہوئے سوگوار دل کے ساتھ واپس آ گئے۔ اور اسی شام جب سورج مغرب کے افق میں ڈوب چکا تھا۔ رضوان بھی دنیا میں ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو کر قبر کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں چھپ گئے۔ آہ رضوان کے چند گھنٹے پہلے کہے ہوئے الفاظ کتنی جلدی پورے ہوئے۔ مجھے اپنا وہ شعر یاد آ رہا تھا جس کے متعلق رضوان نے کہا تھا "کاش ایسا ہو جائے" اور وہی ہو گیا۔

بعد میں اختر نے بتایا کہ رضوان کنارے پر ایک پتھر کے اوپر بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ کہ یکایک پتھر اپنی جگہ سے لڑھک گیا اور چناب کی طاقتور لہریں رضوان کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئیں۔ اختر کی انتہائی کوشش کے باوجود رضوان اس کے ہاتھ نہ آ سکے۔ آہ رضوان تیرنا بھی تو نہ جانتے تھے۔ کاش انہیں تیرنا آتا تو شاید

وہ بچ جاتے ، لیکن ایک مجاہد کی آرزو کیسے پوری نہ ہوتی ۔ جناب کی دستگیری نے اپنے ہاتھ پھیلا کر رضوان کو اپنی آغوش میں لے لیا ۔ واقعی یہ ایک ایسا سوگوار دن تھا جو ہمیشہ یاد رہے گا ۔

اگلی صبح جب میں رضوان کی قبر پہ فاتحہ کہنے کے لئے قبرستان پہنچا تو وہاں ایک عجیب قسم کا ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا اب تو چناب بھی خاموشی کے ساتھ بہہ رہا تھا اور کالی چٹانوں کے تپھر بھی جیسے اپنی جگہوں پہ جم گئے ہوں ۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ڈھلکے اور قبر کی مٹی میں جذب ہو گئے ۔

صاحبزادہ مرزا البشیر احمد ایم ۔ اے ۔

احادیث کی اقسام

حدیث قولی :۔ وہ حدیث جس میں حضرت رسول اکرم صلعم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ بیان کئے گئے ہوں ۔ مثلاً کوئی صحابی یہ بیان کرے کہ فلاں موقع پہ آنحضرتؐ نے یوں فرمایا ۔

حدیث فعلی :۔ وہ حدیث جس میں آنحضرت صلعم کے کسی قول کا ذکر ہو بلکہ صرف فعل کا ذکر ہو ۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت صلعم نے فلاں موقع پہ یہ کام کیا

حدیث تقریری :۔ وہ حدیث جس میں آنحضرت صلعم نے کسی صحابی کے فعل یا قول کو صحیح سمجھتے ہوئے اسے برقرار رکھا ہو اور اس پہ اعتراض نہ فرمایا ہو ۔

حدیث قدسی :۔ وہ حدیث جس میں آنحضرت صلعم نے خدا تعالےٰ کی طرف کوئی ارشاد یا فعل منسوب فرمایا ہو ۔ مثلاً یہ فرمایا ہو کہ خدا تعالےٰ نے مجھے اس اس طرح ارشاد فرمایا ہے ۔ اور یہ بات قرآنی وحی کے علاوہ ہو ۔

حدیث مرفوع :۔ وہ حدیث جس کا سلسلہ آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہو ۔ اور آپ کی طرف کوئی بات براہ راست منسوب کی گئی ہو ۔

حدیث موقوف :۔ وہ حدیث جو آنحضرت صلعم تک پہنچنے کی بجائے کسی صحابی تک آکر رک جاتی ہو ۔ مگر اس حدیث کی نوعیت اور صحابی کا انداز بیان ایسا ہو کہ یہ قیاس کیا جائے کہ یہ حدیث آنحضرت صلعم سے سنی گئی ہے ۔

حدیث متصل :۔ وہ حدیث جس کے تمام راوی پوری پوری ترتیب کے ساتھ مذکور ہوں ۔ اور کوئی راوی درمیان میں چھٹا ہوا نہ ہو

حدیث منقطع :۔ وہ حدیث جس کا کوئی راوی درمیان میں سے چھٹا ہوا ہو ۔

حدیث صحیح :۔ وہ حدیث جس کے تمام راوی حافظہ ، سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں ۔

حدیث ضعیف :۔ وہ حدیث جس کا کوئی راوی حافظہ ، سمجھ اور دیانت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہ ہو ۔

حدیث موضوع :۔ وہ حدیث جس کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ کسی دروغ گو راوی نے اپنی طرف سے وضع کر کے بیان کر دی ہے ۔

اثر :۔ اس روایت کو کہتے ہیں جو صرف کسی صحابی کے قول پہ مشتمل ہو ۔ اور اس میں آنحضرتؐ کی طرف سے کوئی بات منسوب نہ ہو ۔

(چالیس جواہر پارے)

احمد بشارت اللہ

نوجوانوں کے نام

شائد کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات

آج کل سنیما دیکھنے کا شوق عالمگیر ہوتا جارہا ہے۔ ملک کے ہر گوشے کے عوام اس کے بڑے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ اگر بنظر غائر اس شوق کے پس منظر کو دیکھا جائے تو ہمیں اس میں دنیوی زندگی کے روشن اور تاریک پہلو نظر آتے ہیں جنہیں متعلقہ فلمی ادارے نت نئی فلموں میں "اسٹوری" کے الفاظ کے ہیر پھیر سے پیش کرتے ہیں۔ ان میں دنیوی زندگی کے تاریک پہلو کو زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اثر سنیما کے شوقینوں کی اکثریت پر برا پڑتا ہے انہیں برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اخلاق سوز فلموں کو جو مقبولیت حاصل ہے۔ وہ شائد ہی پاکستان کیا دنیا کے کسی بڑے سیاسی رہنما کو حاصل ہو۔ "خربوزہ خربوزہ کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے"۔ ان اخلاق سوز فلموں کو دیکھنے سے طلبا میں بالخصوص اور عوام میں بالعموم ایسی حرکات پیدا ہوتی ہیں جو معاشرہ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اور جن کے اپنانے پر مزید برائیاں پیدا ہونیکا احتمال ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے اپنی نئی کتاب میں اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ عوام میں مجرمانہ ذہنیت کی تقویت کا سبب ایسی اخلاق سوز فلمیں ہیں۔ جن میں متعدد کردار لاقانونیت۔ ڈاکے۔ رہزنی کرتے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ عوام ان ہتھکنڈوں کو اپناتے ہوئے مجرمانہ طریق زندگی اختیار کر لیتے ہیں

دراصل ہمارے ہاں بیشتر ڈرامہ نویس حضرات نے عوام کے رجحانات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسے ڈرامے اور کہانیاں لکھنا شروع کر دی ہیں۔ جن میں تاریک پہلو زیادہ اور روشن پہلو کم ہوتا ہے۔ وہ ایسے ڈرامے لکھ کر اپنی اور فلم کمپنیوں کے مالکوں کی جیبوں کو پُر رکھتے ہیں۔ ایک تو یہی فلمیں عوام کی گاڑھے پسینہ کی کمائی کو چوس رہی ہیں۔ دوسرے ان میں افادیت سے قطع نظر عیش و عشرت کے سامان ناچ رنگ زیادہ پیش کئے جاتے ہیں۔ آج کل اسی پہلو کے پیش نظر جو مقبولیت انگریزی فلموں کو حاصل ہے۔ وہ اردو فلموں کو میسر نہیں۔

پاکستانی عوام ایسی فلموں کو پسند کرتے ہیں۔ جن میں عریانی اور بے حیائی زیادہ ہو یہی وجہ ہے۔ کہ آج کے نوجوان اکثر منفی جذبات سے مشتعل ہو کر برائی کی طرف رجوع کرتے ہوئے اخلاق سوز حرکات پر اتر آتے ہیں۔ جس کا واضح ثبوت آئے دن اخبارات کے کالم بہم پہنچاتے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں ہفت روزہ "قندیل" کے "تماشائی" نے معاشرہ کے اس نقص پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کس طرح ہماری ننھی پود فلم بینی کی طرف مائل ہے۔ کیا ہم اس پود سے مستقبل میں کسی امید افزا کام کی امید رکھ سکتے ہیں؟ آخر ان کا ذمہ دار کون ہے۔ ڈرامہ نویس یا ڈائریکٹر اصحاب تو ظلم کو مرتب کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس فرض سے عہدہ برآ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ

معاشرہ سے بگاڑنے کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے۔ کیا یہی حضرات نصیحت آموز یا معلوماتی پیرایہ میں فلموں کو مرتب کر کے ملک و قوم اور انسانیت کی ایک اہم خدمت سرانجام نہیں دے سکتے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے فلمی پردھانوں میں ایسے خیالات کا فقدان ہے۔ وہ تو "مایا" کے بھوکے ہیں عوام جائیں بھاڑ میں۔

آیئے! اس موذی کے نقصانات بھی گنوا دوں۔

جب نوجوان ایسی اخلاق سوز فلموں کو دیکھتے ہیں تو وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے زمانہ تعلیم میں ہی اوباش بن جاتے ہیں۔ اخلاق سے گری ہوئی فلموں سے لطف اندوز ہو کر اس سے بھی بدتر کام کر کے قومی کردار کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔

کبھی آپ نے طبی نقطہ نگاہ سے بھی فلم بینی کو دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو سنیئے! جن لوگوں کے لئے فلم بینی عادت ثانیہ بن چکی ہے وہ تو ضرور اسے بیماریوں کی جڑ بتائیں گے۔ یہ لوگ فلم بینی کے عادی ہونے اور صحت کے برقرار نہ رہنے کی وجہ سے آئے دن بیمار رہتے ہیں۔ سینما ہال میں رات کو کافی دیر تک جم کر بیٹھنا اور جاگتے رہنا۔ آنکھوں کی بینائی۔ معدہ کی خرابی اور مختلف قسم کی امراض پیدا کرتا ہے۔ ممکن ہے جوانی میں ان بے اعتدالیوں کا اثر ظاہر نہ ہو۔ مگر بڑھاپے میں اسے ہر انسان محسوس کرتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ فلم بینی کا زیادہ تر اثر نوجوانوں کی "بینائی" پر پڑتا ہے۔ پردۂ سکرین پر متواتر تین چار گھنٹے ٹکٹکی لگا کر دیکھتے رہنے سے آنکھوں پر معمول سے زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علموں کی اکثریت عینک استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ہاں! میں ایسے "عینک باز" طلبا کو اس مد میں شامل نہیں کرتا۔ جو حفظانِ صحت کے اصولوں کی پرواہ نہ کرتے کی وجہ سے تعلیم کے دوران میں آنکھوں کی بینائی کمزور کر لیتے ہیں۔

اب ذرا مالی نقصان کو لیجئے! لاکھوں روپیہ جو اس عیاشی پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر کسی نیک یا مفید کام میں لگایا جائے تو اس کثیر رقم سے کئی ایک منافع حاصل ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو گھر کے اخراجات کی تنگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سینما جاتے ہیں۔ اب یہ شوق اتنا بڑھ گیا ہے۔ کہ مزدور جو روپیہ۔ آٹھ آنے کماتے ہیں۔ وہ بھوکا رہنا پسند کرتے ہیں مگر سینما دیکھنے میں ناغہ نہیں ہونے دیتے۔ اس طرح وہ اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا بہت سا حصہ ان فضولیات پر خرچ کر دیتے ہیں۔

سینما بینی ایک خطرناک مرض ہے۔ جو انسانی زندگی کے لئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا تا حال کوئی علاج دریافت نہیں کیا جا سکا۔

حکومت کا فرض ہے۔ کہ قومی کردار میں بلندی پیدا کرنے کے لئے فلمی صنعت کو اپنے ہاتھ میں لے کر اخلاقی اور سبق آموز مکمل تیار کرے۔ کیونکہ قومی کردار کے بنانے اور نوجوانوں کی اصلاح کے لئے یہ ایک بہترین ہتھیار ہے۔

(بقیہ صفحہ ۸)

مٹی کا کھلونا بھی نظر آیا۔ جو آج کل کے ٹانگہ کے مشابہ تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ٹانگہ کے استعمال سے بھی خوب واقف تھے۔ پرانے مرے ہوئے آدمیوں کی ہڈیاں اور کچھ پنجر بھی نظر پڑے وہ آجکل کے نوجوانوں کے جسموں سے لمبے اور چوڑے تھے۔ ایک بہت بڑی پتھر کی انگوٹھی دیکھی جس سے میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ کسی انسان کی انگوٹھی نہیں۔ بلکہ یہ صرف انگوٹھی بنانے والے کے فن کا مظاہرہ ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے۔ کہ اس زمانہ

as to who should claim the spoil. It became the case of the two cats and the monkey. This they said was the village hospital and they, the village belles, who acted as nurses to the lucky sick.

The bodies of the two combatants were recovered the next day and we made merry, for they were the only results of the grand shoot.

A Book-Worm

Ijaz-ur-Rahman III yr.

At this time when the sun has withdrawn its ruddy light from my room and the shadows of the trees in the neighbouring garden are looming over the walls indicating the approach of night, I have sat down in my chair with a pen in my hand and a number of scattered leaves on the table trying to evolve some solution of an inexplicable problem.

There is no one in the room except myself. Some have gone to play Volley Ball and Badminton, others for an evening stroll. One whom I have known since last winter and who in the course of a year has endeared himself to me, might be puffing away his cigarette in wreaths of thin curly smoke in some cinema-house. All of my chums have got quite different tastes. They say I am a book-worm, so they never ask me to accompany them. It is good they have left me alone, so that I can ponder deeper and deeper over my problem with no one to disturb me. I always want a pin-drop silence in my room to suit my speculative reveries.

Sometimes an idea strikes my mind and I think I have got the solution. I apply the method and get the answer, but it does not tally with the one given at the end of the book. So I begin thinking anew. There are some situations in life where only one thing that matters can happen. For example to a man fallen in a ditch the only thing that matters is that he should get out. And the thing that matters to me now is that I should get the corfect answer to my problem

Every time I raise my head a face arrests my attention. Though I do not believe in the supernatural, yet the presence of the face terrifies me. I can simply say that it is the face of a man. But I can't recognize him. Yes, one thing I know. It is behind the mirror. But it can't be my face. My eyes cannot deceive me. This wan ghastly face cannot be mine. Of course, the face on the identity-card is my own and I can recognize it even after ten years have gone by. Perhaps it is some optical illusion caused by a heavy strain on my eyes. Let me wash my face and breathe some fresh air and then consult some other mirror. But if I go out much of my precious time will be wasted and the problem in hand will remain unsolved.

This nasty bit of question has upset my whole programme. I have still to study Physics and English and write an essay, all which will take more or less five hours. It is already six o'clock. So I must work uptill eleven. Now, let me be quiet and silent and remove this mirror from here. It stirs all sorts of uncanny thoughts in my mind. Instead of being a source of inspiration it causes fidgety distractions.

From tomorrow I shall certainly be getting up earlier than usual and going out for a walk to improve my health. But, I am sorry, I have got to write an article for the college magazine on the morrow morn. So let the open air rambles be from day after tomorrow.

carefully looked at us. Three or four Rhinos stopped a few yards away from us and prepared to move in our direction. Their leader, a huge monster with a bull-dog mouth, quickened his pace in preparation to charge us. All of us could'nt utter a word, we were petrified with terror. He was now coming on and we would have been smashed to smithereens. I suddenly thought that if we opened the lights, the Rhino would be blinded and the danger of the onset would be averted. I pointed to the light switch and Dad caught the idea.

Just as the Rhino was twenty yards away, the lights were suddenly switched into the eyes of the charging monster, his speed was checked and his attack only damaged the radiator, besides making a few of us lose their senses. The second Rhino prepared to charge. His charge left us minus a mudguard and headlights. The other two moved off.

These were my thoughts as I lay there behind the stump of a tree, a quarter of my senses left in me and myself unable to move. All I could see was that the first Rhino had turned back and was getting ready to charge. I prayed to God to forgive my sins, for now I expected the end to come soon.

I was unconscious for a few moments. On recovering I saw a Rhino each on either side of me; they must have missed me and I prayed that my luck should hold out till I got help. But God provides for his men and I was saved in a miraculous way. The two beasts were again lolling up and were about to charge when I again fainted.

When I woke up I found myself lying on bed, I could hear anxious faminine voices and whisperings. This was surely heaven, it had all been painless, God indeed was right when he said that death was painless, and only a short sleep, a sleep which was to end in supreme bliss. Oh! My hopes and expecations were all shattered when I tried to move, for I experienced a great pain. I was forced gently back to my original position. I looked round and instead of seeing the Angels of Heaven, saw only the Angels of Earth.

I asked how I came to be there, and was told that some villagers had heard, last night, strange noises which they had guessed to be coming from two Rhinos fighting. On going to the scene they found me lying unconscious, wet with dew and stiff all over. The Rhinos had been fighting in the back ground so as to decide

were to stay at the Bungalow while we did the hunting.

The party was split up into three jeeps and they were to go roaming a certain area till they caught up with a herd of Rhino who were reported to have been seen in that area a few days ago. We had set out early in the morning and been roaming aimlessly for half the day without so much as hearing a hoof beat. Mr. Gilbert, who was with us, he being of rather a delicate constitution, suggested that we should return, but the guide and Gregory had insisted that we should roam round some more till we should find some thing. My father, who was at the steering, nothing loath, seconded the idea and we roamed for another hour without anything happening. I wished we had gone back when Mr. Gilbert told us to go for them. I would have been hale and hearty now, but hardly had five minutes passed when suddenly a deep roar as of thunder was heard, just approaching us. I pointed it out to Mr. Gilbert who was sitting next to me, but he attributed it to the engine. As we turned a bend round a clump of junipers, the sight that we saw left us all aghast. and we all, with one voice shouted to Daddy quickly to turn the jeep. For who was to cope with that vast host of about thirty Rhinoceroses coming straight at us ? We were in danger of being trampled to death, for they were coming at a light gallop.

The sight of that huge army, a compact mass of horns and solid flesh was enough to frighten and bewilder the nerves of the strongest, and then coming straight at us, it was beyond our endurance.

Mr. Gilbert had fainted, I had'nt the strength left to move a muscle, the guide was in a coma, Gregory and Dad were, it seemed, the only ones who could do something. There was no time to turn, so Daddy started backing very fast, thinking that he would find a place in which he would be able to dodge the Rhinos.

The jeep had retraced its path by about a hundred yards, the Rhinos were only ten yards away now, All this had been a great strain on father and he could'nt control the wheel any longer. There was a tree by the side of the road and into this we banged. The jeep changed direction and we thanked God that by some miracle of His, we had been saved. The herd thundered past us and we heaved a sigh of relief.

The last few Rhinos had lingered slightly and on passing had

who knows that in the heart of their hearts they were waiting for many such delegations which should promise and should never turn up. Their lips may be reproving the ineffeciency and incapibility of the organisers but their hearts may be thinking in quite another strain.

MIR GOES

Mr. A. D. Mir has unexpectedly left our Department of English to join government service elsewhere. He has been in our college for the last two years and the gloomy aspect of his departure becomes all the more gloomy, when we see that this year there has been an unprecedentedly huge admission in the First and Third year classes.

"We are trying our utmost to fill the wide gap caused by his departure," told the Principal to a representative of the students. But, of course, Mir Sahib was a man of very short stature and it would not have taken long to fill the breach.

The man who is likely to gain or suffer (I am afraid I have to use both the words) by this "Mir desertion" and strong admission, is our stalwart, Prof. Akh. Abdul Qadir, whose already numerous periods are likely to be further multiplied. We wish Mr. Mir good luck and bright prospects and at the same time for Prof Akhwand's health so that he should continue discharging his double duty, so long as somebody else drops in.

Between Four Horns

Bashir-ud-Din Ahmad III yr.

"Quick, before he comes back, the handle Gregory, now's chance," these words were shouted out by father to my elder brother. He quickly got out of the jeep, whirred the handle round once, and soon the engine sputtered into life. Dad pushed in the gear, starting off with a jerk which made me fall right off the jeep on to the ground behind.

It all started a few days ago, Father had got an invitation to a Rhino hunt, due to be held in the forests of Nellie a village near Nowgong in Assam. Mr. Gilbert who was a fast friend of Dad's was organising a big shoot in order to celebrate a bumper crop of tea from his gardens that year He had invited all of us and three other families, the ladies

College Round Up

Our Special Correspndent—

THE election fever is gradually subsiding and by the time you peruse these lines, the temperature which on the eve of the Union elections touched the unprecidented heights will have fallen to the freezing point. We are not concerned with their results or their ultimate effect or their merits and demerits. But it is a novel experience for the newcomers in the First Year class and it makes them feel a major difference between the dull and dreary school life and that of the college in which they have just made their appearance. Their first impression of being mere fools and insignificant creatures is suddenly dispelled when they receive frequent visits by the senior-most students in the college. They feel that they are something and this conversion from nothing to something gives them a sense of responsibility and a new touch of personal diginity and self importance.

The aged contractor of the tuck-shop with his Stalinesque moustaches and in his jerky voice, with all the seriousness he could command, remarked, "Could'nt it be possible that the elections were held every month ?" and he is seriously thinking of making a representation to the Principal to this effect.

Immediately after the conclusion of each election there is such an overcrowding in the hostel mess that the furniture and crockery become inadequate and the mess servants honestly feel that they deserve some extra allowance for overwork.

BENGALI DELEGATION

Thanks to the whims of the organizers, the Bengali students' delegation could not visit our college. The cold-drinks which were so warmly arranged were coldly received. Thanks to the co-operation of some of the staff members. The union authorities were able to put an end to the cold material and feelings. The coolness of the icecream was neutralised by the ardour of the Principal and the Staff, who did full justice to it Apparently the Union office bearers were seen with long faces and loosened knots of their neckties, which had been purchased and borrowed for the purpose, but

The Morning Star

Syed Ejaz-un-Nabi

1. Sweet lonely Morning Star ;
   Thou shineth in perpetuity,
   In heaven's remotest deep corner
   Thou liveth in serenity.

2. I revel in mirth and glee
   At the purity of thy sight,
   And fathom the depths of my soul,
   By the warmth of thy light.

3. When despair shadows the soul
   And when sorrow darkens life,
   I fly to thee for solace,
   From life's eternal strife.

4. But why so aloof from thy species,
   Why so removed from thy kind,
   Thou liveth like a solitaire,
   And in seclusion happiness find.

5. Is it really in penance,
   That thou art ordained to live ?
   Hast thou committed a heinous sin,
   That Providence deems hard to forgive ?

6. This lustre, purity, glory of thine
   I adore, sweet little star !
   Into the cells of my being ,
   Thou poureth a nectar.

7. Thy sighs and thy tears,
   In thy light I see,
   I long, I aspire,
   For a place beside thee.

would have been quite within the limits of reason if these students had come only with the purpose of drinking coffee and then hurrying back to their institution. Their visits are often made under the pretext that coffee enables them to remain awake till a late hour at night. But what a shock it would be to you if on inquiring a student about the object of his visit, you get the answer, "Just because it is the only place where we can easily spend two or three hours." And we find him so confident and unperturbed in his reply that we begin to feel that the object of a student has become not to gather knowledge but to spend his time-whether in cramming books or in useless pursuits, is immaterial. Perhaps, they have studied Stevenson's 'Apology for Idlers' and now are following it as a matter of courtesy, or perhaps, with the idea that if idleness can bestow on a man Stevenson's calibre there seems to be no reason why should'nt they become as great and famous.

Or they might have read the lines written by Wordsworth which are in no way less detrimental than the aforementioned apology.

"Enough of Science and of Art ;
Close up these barren leaves ;
Come forth and bring with you
a heart.
That watches and receives."

It really pains one's heart to observe the manner in which they are dreaming their time away, quite unaware of their mission in life.

The dissertation can be prolonged ad-infinitum, but there is much convincing force in the oft-repeated quotation that the interest in writing varies inversely with its length.

Being a new and zealous nation we should aspire for higher ideals and for the things which are rational but, hitherto, beyond the reach of man.

Let us pool our resources to stem the rising tide of lethargy and idleness. We should bear in mind, 'Time is money' as the old saying goes, lest we should lapse into a state of oblivion and opium eating, and our misdeeds should bring us almost to the verge of ruin.

I think, I should turn to my subject. The object of the following brief dissertation is manifold and aims at such higher ideals as are the blessed heritage of every man.

In Lahore there are many historic monuments and modern buildings which are worth seeing and among these, there is a coffee house. A brief study of the people sitting in it will give us an idea of our society. In front of its building we find a large number of bicycles and so we can easily guess that the people sitting inside cannot afford to enjoy cushioned drives, in other words these are the middle class people.

In this hall the representitives of almost every community are found, writers—progressive and orthodox, journalists, business men and lastly the students.

We find them, their legs stretched, their cigarettes lighted and the cups of black coffee placed before them. In one corner of the hall we find some writers seated in a circle and if we sit there for an hour or so, a gradual increase in the circumfrence of the circle is noted. Their dry curly hair, pale rugged faces, shabby looks and tell-tale dresses proclaim that they live from hand to mouth. Whenever they are able to persuade a publisher that their new fiction or play is a masterpiece of art and literature they manage to wrench out a few chips from his bulging pocket. Thus visiting the Coffee House is a matter of faith and duty with them. There is no end to their roars of laughter, screams and clouds of smoke melting away into the air.

One evening I continued staring at them when the idea came to my mind that these were the best brains of our country and had their application been as useful, we would have attained that goal of human decency and perfection for which we seem to be striving. But training and environments had made them nothing less than the mute enemies of their country and religion. They were inclined to different human scourges like communism, godless materialism and God knows how many isms of similar nature and soaked in the blood of humanity.

No matter whether it is Saturday evening or Sunday morning, a group of students will always be there, occupying another corner of the hall. Such groups sometimes consist of the students, whose peculiar beards show that they are our college mates. It

are intelligent and sensitive ; and if you harness these gifts to your ends, few can compete with you. I don't know how you will receive these observations of mine, allot to them their proper place—the waste paper basket or give them a passing thought. They may not be worth it, but they certainly ring with sincerity and earnest regard. I don't preach to impose, I merely suggest. At least these lines may be able to earn me the right to occupy some occasional place in your prayers. I may not deserve your prayers, but I certainly need them. To be an elder brother is a thankless job, it is difficult to explain things every time. You take some course. Hence the consequent misconception and distrust.

I conclude it with best wishes for your health, and prosperity and happiness.

Your affectionate brother,

U. OMER.

The Coffee House Trend

Ras Tarique I yr.

THE historic city of Lahore has got a charm of its own and any favourable description of this city or otherwise depends upon the angle from which it is viewed. A foreign visitor may call it 'a city of gardens' and a local inhabitant of the walled area may term it 'a city of slums, poverty and squalor'. Of course, both the views are parochial. The colourful and magnificent procession of the Shah of Iran could only move along the main highways of the metropolis which run through gardens. The Shah, (who called it a city of gardens) was, therefore, quite right in forming that opinion as the spring season had at that time lent charm and elegance to the beauty spots. How our Royal Visitor could know that not very far from these platial buildings and gardens there was a world where misery reigned supreme, and ignorance, disease and hunger were the common lot of the people ! How he could know that the majority of the citizens, living in the dark, narrow and winding streets of the city, had never visited these places in their whole life. In no other country of the world such a social disparity was to be found in such a hideous form. Lest I should be suspected of propagating communism, (which being a Muslim should be far from my thoughts),

them at their own game and we must try to deserve that honour, we must surpass them at all costs. What self complacency! As facts stand, we are far behind them in this respect, their tenacity, earnestness and zeal are almost religious. We must reconsider our position. Are we honestly living up to the standard expected of us ? Our youngmen, and I don't exclude myself, are sincere, they are responsive but somehow I feel that they lack that emotional consonance of feeling with belief that is a veritable fire, that restlessness which is the spice and privilege of youth. Somehow we have taken to the dangerous habit of comparing ourselves with the other eastern nations. Comparison with the worst is no comparison, it is self-deception.

So my earnest request as an elder brother is : have a set and defined programme. It should be almost tough and follow it with an obstinacy only to be equalled by your earnestness. And if you do it, I can assure you, you wont come back at the end of the vacation with a long face as if you were going to weep.

I know it needs an effort to attend to work, which habit we sadly lack. But this is all ; just a little practical attention and everything comes with an ease and docility that will surprise you. Regularity breeds confidence. The number of casualties on the eve of examination would be cut down by 100 per cent if only we could manage to be regular, regular in our studies, regular in our exercise, in rest, in meals and prayers. I think life would be a comedy if we could be regular, and nothing short of clockwork regularity would do. Never be satisfied with anything less than that. And it cannot be done unless we give up day dreaming and don't indulge in sentimental sob-stuff. The late King George used to pray, "O God ! give me sentiments but don't give me sentimentality". Sentimentality is very dangerous. It reduces one to the status of an opium eater. You become a mere poet. You cease to be human. You are either super-human or sub-human, usually the latter. You cease to live, you only exist. With day-dreaming all activity of the life-urge flags, life sinks into inertia, a mere coma. Prophets don't come to breed inertia. They create a stir. Even the dead are brought to life and the living exalted to a still higher plane of life.

You enjoy one advantage over many of your companions. You

A Senior Speaks

Usman Omer III year

Appropriately this Letter should have been published immediately before the vacations. But the advice contained in it is of general value and such things seldom get stale.

—Editor.

My dear Brother,

Possibly this letter follows you close at your heels It may not overtake you but it will certainly reach you, little though you expect it. The purpose of this letter is manifold, Firstly to remind you that you left without seeing me and thus torpedoing the very appropriate opportunity of my saying something to you personally as to how you should spend your vacations, What follows could aptly be summed up in these words. "Spend your vacations by all means, but do not waste them". Spending and wasting connote two absolutely different things. While the former suggests propriety, method, singleness of purpose and a concentrated effort to achieve that purpose, something you can afford reasonably as well as actually, the latter appears to be the very negation of all this. When you spend, you always get something in return. If you don't gain, you are none the worse for it. But when you waste, you are a total loser. So spend your vacations but don't waste them. I am sure you are well aware of the fleeting nature of the apparently long vacation. The holidays, somehow, slip through your hands, with a little or no opportunity for waxing sentimental or staging a moping programme at home. I hope you will find more time for study. Don't make future plans. Start just now, otherwise you will never be able to start and one fine morning or should I say one sad morning may be September 8, you will catch yourself standing at the very end of your summer vacation. I hope you know the oft-quoted words of Lenin, he said to the younger generation of Soviet Russia. "First, study, second, study hard and third, study still more and still harder." That is how our most dangerous and potent enemies are wont to work. Should we simply remain content with vieing with them (and this is no small thing) in our study and work? No if we have to defeat

comfort in a future existence. Some have been discovered even in catacombs. Five thousad years ago, a city flourished in the valley of Indus. Its children loved playthings and from its mound—Mohanjo Dero—many toys have been exhumed; models of men and women, animals, birds, carts and household articles. No great skill was needed to make these. A piece of clay was modelled roughly into whatever the mood of the moment fancied, and then it was sun-dried and oven-baked. The little modellers were ignorant of anatomy, knew little of form, and so often we get a hare with a long tail or a cow with a short one. Thus we find rhinoceroses, bulls, rams, dogs, elephants, monkeys and sqirrels among the favourite toys of ancient children. Right through the ages till the 20th century is reached, can models of animals with movable limbs be traced. Ducks that open their bills, monkeys that climb sticks, rabbits that jump are fascinating to the modern child as were the cat with the movable jaw and the cow that could lower its head to the child of Abraham's time. Some of the Indus toys are particu'arly interesting, a painted wheeled toy-cart of today is approximately contemporary with the chariot depicted on a stone slab at Ur, which is dated as about 3200 B.C. Similarly you can see at the Texila Museum some specimens of delightful toy-tanks with frogs and tortoises decorating the floor, whilst birds rest with outstreched wings on the edge as if about to sip water. Toy bird chariots were well-known in ancient Greece, China and India, and still do they delight the children of our homes. The bird fastened to a pair of wheels, was drawn by a string attached to a loop or passed through a hole below the neck of the bird, and so it was dragged along in 2600 B.C. Humped bulls, wheeled horses, winged camels, horned elephants delighted the child of old Asia Minor and China as well as they do nowadays. Marbles and balls of clay, rattles with pellets inside, also were the delight of the ancient children as they are now in this enlightened and civilized world. The modern age demands that a date, a period of time, be assigned to every discovery, but what have such dry-as-dust things to do with the evanescent joys of childhood?

be imagined at this gross injustice done to their community.

The educational experts unanimously contribute to the view that education is more a matter of intellectual atmosphere and environments than of mere conning the text books and passing the examinations.

The indiscriminate award of degrees to such undesirable persons is a heinous crime against the bonafide student community. It is causing a tremendous loss of national energy and in a way it is an act of grievous national sabotage. If our universities are to maintain their fast dwindling reputation they ought to block up all such side roads as lead towards cheap graduation. In the interest of education and national prestige it is of paramount importance and the urgency of the problem demands that a legislation should be immediately enacted to this effect.

Play-Things of Old

A. R. Junaid Hashmi

Childhood is playtime. How else could the long, long and dreary hours be filled? Through all ages, tiny, unskilled fingures have shaped from clay pots and pans which their loving mothers daily used in kitchens. Some of the objects are very poorly made, of-course, but still there are some such attractive playthings that one can easily imagine that a fond father has modelled them to delight the heart of a small son. Boys have always loved whistles and what lad could resist blowing through an aperture in the tail of a clay-bird in order to produce a shrill sound? Such whistles were common with the children of long long ago, too. Little girls have always loved dolls. We can be well sure that ancient Egyptian girls fashioned a baby from the river's clay and, wrapping it in a bit of skin, had joy in so doing. By the way, the doll is, perhaps, the oldest of toys. Some hold that the word 'idol' is connected with 'doll.' Yet no fact is more certain than that with the first children came the first playthings, because the instinct of play is primitive. In ancient Egypt, in Asia Minor, in Rome and in Greece as well as in old India, historical excavations have proved that these puppets were common. They have been found buried with their little mistresses as if they were placed there for joy and

circumstances, then we must try to reconcile them, and achieve a sane adjustment. Let us think calmly and well on this subject and in doing so we should not let passion sway our reason, and this fact is universally acknowledged that if and when passion overwhelms reason, the consequence is nothing but calamity and ruin.

Our University seems to have realized it just in time and now once again English is being introduced as a medium of instruction in the high schools. Of course, every one of us is actuated with the desire to see the triumph of Urdu as an international language, But Rome was not built in a day. The object should be pursued slowly and steadily, though with ever-increasing zeal and enthusiasm. But it should in no way impede our onward march and such a minor thing should not clog the running wheels of our national coach on its way to the goal of all round happiness and prosperity. We stand for much higher ideals and the conception of this newly born state does not mean indulging in sectional, racial or lingual feuds which are unbecoming of a great nation, particularly of us, who aspire for giving a lead to the world and humanity which both, we are afraid to say, are drifting towards a dismal end.

II.

MASS GRADUATION

The rapid multiplication of unemployed graduates in our country has become a problem and its enormity is in no way less than that of the other problems which are occupying the minds of the people at the helm. In his college days a student nurtures such ambitious plans in his fertile brain as are never to be fulfilled. He dreams of things which are destined to remain dreams and never to be materialized. Thrown out of this rosy world he finds himself in a twilight wilderness, extending beyond the limits of his imagination. Graduation in our country has become so cheap, rather to be more accurate, has been made so cheap by the universities.

The Bathinda Traffic (I need not explain the term, as it is so common) has reduced graduation to a state of utter ignominy. By this method the people, who have never been to a recognized educational institution, manage to have the highly coveted honour of being graduates.

Wide is the way and open the gate which leads to graduation. The mental pain and frustration of the regular students, who have spent their whole lives in attending the institutions, can very well

Editorial Notes

Sane Recovery

TO be an Editor is an irksome job. In fact the very word 'Editor' connotes a heavy burden of responsibilities and hardships. Particularly the Editorial Staff of the English Section has had to experience many difficulties in compiling this issue of the magazine. It is really painful to note that our duty is not only to select the best but to hunt for the writers and it is after persistent efforts and continued reminders that we have been able to wrench out these contributions. This deplorable lack of interest, on the part of the students, leads me to think of the fundamental defect in our current educational system. The dual policy of our government and the University to encourage Urdu and at the same time to maintain a remarkably high standard of English, has resulted in a lamentable failure. The politicians and educationists, alike, are found to be leaning towards Urdu unnecessarily. Lest I should be accused of preaching occidentalism, let me unreservedly express my love for my mother tongue. I do not intend to deprecate Urdu—far it be from my thoughts. But after all we have to take many other things into consideration which are of more importance than the mere exploitation of the patriotic sentiment of the ignorant masses.

The two centuries of foreign domination, which might well be regarded as an era of intellectual disability, have made us extremely miserable in every respect. We are hopelessly outdone by the Western world in every branch of knowledge and learning. Our parochial tendencies and religious narrowmindedness have kept us back in the fields of Natural Sciences, Art and Literature.

Now to abolish English by a single ruthless stroke of pen will mean putting back the hands of the educational clock by another century. Our love of the mother tongue may hinder us from adopting such a liberal attitude towards English, but it should not blind us to certain other factors which matter. Common sense demands that if we can't change the existing system and the prevailing

بسم الله الرحمن الرحيم

ALMANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

November 1953

★

Staff-Editor
Prof. Akh. M. Abdul Qadir, M. A.

Editor —Kunwar Idrees
Asst. Editor—Ijaz-ur-Rahman

★

CONTENTS

Vol. 3		No. 4
1. Editorial Notes	Kunwar Idrees	2
2. Play-Things of Old	A. R. Junaid Hashmi	4
3. A Senior Speaks	Usman Omer	6
4. The Coffee House Trend	Ras Tarique	8
5. The Morning Star	Syed Ejaz-un-Nabi	11
6. College Round Up	Special Correspondent	12
7. Between Four Horns	Bashir-ud-Din Ahmad	13
8. A Book-Worm	Ijaz-ur-Rahman	16

Printed at the Dastkari Press, Lahore and Published by A. R. Junaid for the T. I. College Lahore

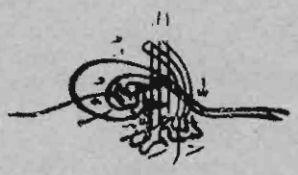

بديع السموات والارض ط انى يكون له ولد ولم تكن له صاحبةط وخلق كل شىء ج وهو بكل شى عليم
ذالكم الله ربكم ج لا اله الا هو ج خالق كل شى فا عبدوه ج وهو على كل شى وكيل

102. The originator of the heavens and the earth ! How can He have a son when He has no consort, and when He has created everything and has knowledge of all things ?

103. Such is Allah, your Lord. There is no god but He the Creator of all things, so worship Him. And He is Guardian over everything.

(102-3) Pt. 7 Ch. 6, AL-AN'AM.

CONGRATULATIONS

Almanar congratulates the Principal on the auspicious occasion of the birth of his third son Luqman Ahmad. We wish the youngest scion of this illustrious house a long, useful, happy and prosperous life worthy of his distinguished forbears.

Talim-ul-Islam College

Matiullah Dard
10/12/53

Magazine

Almanar

November 1953